باب6

گھر سے گھر تک
مقبوضہ کشمیر سے آزاد کشمیر

ہمیں ہجرت کے سارے رنگ بھاتے
ہمیں سنت نبھانا آ گیا ہے

نانا' پیر حسام الدین کی رحلت اور پاسپورٹ

شادی کے بعد میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے پاکستان جاؤں، اس پر میرے نانا مرحوم اصرار کرتے رہے۔ ان دنوں ہندوستان اور پاکستان کے آپس میں سفارتی تعلقات نہیں تھے جو 1971 کی جنگ کے دوران منقطع ہو گئے تھے۔ میرے خیال میں سوئٹزرلینڈ کا سفارت خانہ دونوں ملکوں کے درمیان ویزے کی سہولت کا کام کرتا تھا۔ میں نے اس سلسلہ میں پاسپورٹ کے لیے درخواست دی۔ ہندوستان میں پاسپورٹ حاصل کرنا کارے دارد والی بات تھی اور اب بھی یہی ہے پوری فائل نما درخواست فارم پُر کر کے دینے پڑتے ہیں۔ ان دنوں پاسپورٹ آفس بھی دہلی میں ہوا کرتا تھا۔ ان حالات میں پاکستان جانا خیال ومحال والی بات تھی میں

نے اللہ کا نام لے کر فارم منگوا کر مع اپنے دو بچوں اور بیوی کے دہلی جا کر خود پاسپورٹ آفس میں جمع کروا دیا۔

اس کی تحقیقات اور چھان بین کے لیے کاغذات ہمارے علاقہ میں آئے جہاں متعلقہ لوگوں نے میرے ساتھ رابطہ کیا میرے خیال میں RAW یا IB کے کسی شخص نے میرے بارے میں جو رپورٹ لکھی کہ اس کا اختصار تقریباً یوں تھا۔

Surprisingly the most genuine case I have ever seen in my career who is living in India without seeing his parents who are at the distance of just a few miles away from here in, POK.

یہ رپورٹ مجھے ایک پولیس آفیسر دوست نے دکھائی۔ اس شخص نے انتہائی دیانتداری سے یہ رپورٹ کی تھی کیوں کہ سن شعور کے بعد کبھی والدین کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کبھی ایسا احساس تھا۔ یہ احساس مجھے میرے نانا جان نے دلایا کہ میں اپنے والدین سے بھی ملوں۔ انہی کے اصرار پر میں نے ایسا کیا، وگرنہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا اور نہ ہی کبھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی کیوں کہ مجھے اپنی ننھیال میں اتنا پیار ملا کہ شاید والدین نہ دے پاتے۔

جنوری 1976 کے وسط میں مجھے بذریعہ رجسٹرڈ لیٹر دو پاسپورٹ مل گئے۔ دونوں بچوں خالد اور فہمیدہ کے نام ماں کے پاسپورٹ میں درج تھے، اب تو نوزائیدہ بچوں کے لیے بھی الگ پاسپورٹ بنانا پڑتا ہے۔ اسی دوران میرے نانا جان بیمار ہو گئے اور یہ بیماری شدت اختیار کرتی گئی۔ بالآخر 22 مارچ 1976 کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بیماری کی حالت میں بھی وہ مجھے کہتے رہے کہ اپنے والدین کے پاس ضرور جانا۔ ؎ موت کا ایک دن معین ہے!

ان کی رحلت کے بعد ایک ناقابل عبور خلا پیدا ہو گیا۔ میری امیدوں، پیار اور خانگی سرگرمیوں کا مرکز تحلیل ہو گیا۔ گھر وہی تھا باقی سب لوگ بھی وہی تھے لیکن اس کی مرکزیت اور اہمیت ختم ہو گئی۔ بہت ہی حسب حال بات ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے یا Love begets love ہمارا ایک

دوسرے کے ساتھ برابر کا پیار تھا۔ ہم ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے۔ بیماری کے عالم میں وہ صرف میرے ہاتھ سے کچھ کھا پی لیتے تھے۔

میرے نانا جان مرحوم پیر حسام الدین کا مزار کنڈی کرناہ میں مسجد کے ساتھ ایک زیارت کے اندر بنایا گیا جو عقیدت مندوں کا آج بھی مرکز ہے۔ لوگ ان کے مزار سے آج بھی تبرکاً مٹی اٹھا کر لے جاتے ہیں اور اپنے اور اپنے بچوں کے لیے خاکِ شفا سمجھتے ہیں۔ یہ لوگوں کی جہالت ہے یا ضعیف الاعتقادی لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ مرحوم کی بزرگی اور برتری وہاں کے لوگوں کی جسم و جاں میں سمائی ہوئی ہے۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں، وہ ننھیال کی اور ان میں سے بھی اپنے نانا جان مرحوم کی وجہ سے ہوں۔ وہ مجھے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں مشکلات اور مصیبتوں کا مقابلہ صبر اور حوصلہ سے کرنا۔ اگر تمہاری اپنی کوئی غلطی نہ ہوئی تو کامیابی بالآخر یقیناً تمہاری ہی ہوگی۔ ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ اور خوش اخلاق اور نیک نیتی سے پیش آنا خواہ تمہارے ساتھ جیسا بھی برتاؤ کیا جائے۔ حق اور سچی بات پر ڈٹے رہنا، خواہ اس میں جان جانے کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو کیوں کہ حق گو کو اس کی غیر حاضری میں دشمن بھی حق گوئی کہتے ہیں جو اس کی بخشش کا باعث بن جاتا ہے۔ اللہ پاک مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔ ان کی نصیحت میرا جز و ایمان ہے اور اس پر عمل کر کے اللہ نے مجھے میری بساط سے زیادہ نوازا ہے۔ آج بھی ان کا قرب محسوس کرتا ہوں۔

زندگی بھر تو ساتھ ساتھ رہے ایسے کوئی وفا نہیں کرتا

دہلی میں پاکستانی ویزا

میں نے باقی رشتہ داروں سے مشاورت کے بعد فیصلہ کیا کہ پاسپورٹ ملنے کے بعد ماں باپ سے مل لینا چاہیے۔ اس لیے میں نے دہلی میں سوئٹزرلینڈ سفارت خانہ کے ذریعہ درخواست جمع کروادی۔ ادھر پاکستان میں اپنے بھائی نذیر گیلانی کو میں نے اس بارے میں مطلع کر دیا اور یہاں ان کی کوششوں سے بذریعہ telex ویزہ کی منظوری اور سفارت خانہ میں رابطہ کرنے کی اطلاع دی گئی۔ میں

دہلی آیا اور پاسپورٹ پر ویزے سٹیمپ کروائے۔ دہلی میں میرے سینئر ایڈووکیٹ اور استاد مبارک شاہ صاحب مرحوم مقیم تھے جو ان دنوں سوڈان کے لیے ہندوستانی سفیر کے طور نامزد ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس ہی ٹھہرا۔ ان دنوں میں وہ خود مختلف سرگرمیوں میں مصروف تھے اور فارن آفس اور دیگر لوگ ان کو سوڈان کے بارے میں آگاہ کرتے رہتے تھے۔ کبھی وہ خود مختلف وزارتوں میں جاتے اور کبھی ان کے گھر پر لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے ایک روز ایک وجیہہ شکل وصورت کا شخص ان کے پاس آیا۔ میں ان کے پاس سے اٹھنے لگا لیکن انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے میرا اس سے تعارف کروایا، دیگر باتوں کے علاوہ کہا کہ یہ کرناہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے والدین کو دیکھنے اور ملنے کے لیے پہلی بار پاکستان جا رہے ہیں اور یہاں ویزہ لگوانے آئے ہیں۔ انہوں نے اس شخص کا تعارف کروایا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ البتہ کہا کہ یہ انڈین شپ یارڈ کے ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ اس شخص نے لفظ کرناہ کو کرنال سمجھا جو ہندوستان کے ہریانہ صوبہ میں اس وقت کے ہندوستانی وزیر دفاع بنسی لعل کا حلقہ انتخاب تھا۔ بنسی لعل اندرا گاندھی سے خصوصی قریبی تعلقات کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ میں نے کہا، نہیں جی کرناہ / ٹیٹوال۔ یہ بات سن کر وہ شخص اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور ٹھیٹھ مظفر آبادی زبان میں کہا، ''او یرا میں مظفر آباد پٹھکہ سکھاں دار ہنڑ والا آں۔ گلے مل۔'' اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میرا باپ ٹیٹوال میں پوسٹ ماسٹر تھا اور میں اس کے ساتھ ٹیٹوال میں اس زمانے میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا، جب انقلاب آیا۔ فلاں فلاں لڑکے میرے ساتھ پڑھتے تھے، ان میں سے چند ایک میرے رشتہ دار بھی تھے۔ اس نے کہا، جب وہاں سے واپس آؤ گے تو مجھے پٹھکہ، کہوڑی کے فلاں فلاں لوگوں کے بارے میں معلومات دینا۔ اس نے علاقہ کے مختلف لوگوں اور جگہوں کا ذکر اس عقیدت سے کیا جس عقیدت سے ہم لوگ حرمین شریفین کا کرتے ہیں۔ اس پر مجھے فارسی شعر یاد آئے:

خاک وطن از ملک سلیمان خوشتر است
خار وطن از سمبل و ریحان خوشتر است

یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد
می گفت کہ گدا بودن کنعاں خوشتر است

دہلی میں ہندوستان کی وزارتِ داخلہ میں ایک پنڈت جو پنڈتا کے نام سے مشہور ایڈیشنل سیکریٹری تھے۔ان کی وساطت سے مجھے سوئٹزرلینڈ کے سفارت خانہ سے ویزا لگانے میں مثبت سہولت ملی۔اللہ ان سب کا بھلا کرے۔

پاکستانی سفر کی تیاری

میرا پاکستان میں آباد ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کبھی ایسا سوچا تھا کیوں کہ زندگی کی اٹھان بچپن سے جوانی تک کی ہوتی ہے جس میں تعلق واسطہ اور پیار و محبت اور نسبتیں قائم ہوتی ہیں۔ڈھلتی زندگی صرف گزر بسر ہوتا ہے۔ نئے ملک، نئے ماحول اور اجنبی لوگوں میں آباد ہونا، نام اور مقام بنانا کافی مشکل کام ہوتا ہے گو کہ ناممکن نہیں ہوتا۔اس لیے میرے سسرال والوں کو اطمینان تھا کہ اس نے والدین کے پاس نہیں رہنا واپس آنا ہے۔اگر ان کو یہ یقین ہوتا کہ میں واپس نہیں آسکوں گا تو ممکن ہے مجھے آنے ہی نہ دیتے لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔انسان تو محض ارادے باندھتا اور توڑتا ہے۔اسی لیے حضرت علیؓ نے کہا تھا کہ مجھے اللہ کی ہستی کا یقین اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے ہوتا ہے۔

میں نے دوستوں یاروں اور رشتہ داروں سے میل ملاقات شروع کر دی۔ ہمارے جیسے پسماندہ علاقے میں جہاں لوگوں کو رسل و رسائل اور مواقع میسر نہیں ہیں لوگ زیادہ تر اپنے گھر گاؤں میں ہی رہ کر روکھی سوکھی پر گزارا کر لیتے ہیں اور اگر کبھی گاؤں یا علاقہ سے باہر کا سفر مقصود ہو تو تمام واقف کاروں سے بخش بخشوا کر نکلتے ہیں کہ خدا جانے پردیس میں کیا ہو جائے اور زندگی کا بھروسا بھی کیا ہے اس پر طرہ یہ کہ ہندو پاکستان کے تعلقات چھوئی موئی جیسے ہیں، جو شام ڈھلتے ہی منہ موڑ لیتے ہیں۔ نہ جانے کس ذرا سی بات سے تعلقات کی شام ہو جائے اور لوگ اِدھر اُدھر بند ہو جائیں۔ میری رشتہ

داریاں اور تعلق داریاں چوں کہ وادی کے مختلف حصوں میں تھیں، اس لیے حسب رواج اور حسب الحکم سب کو ملنے کے لیے جانا پڑا اور سب کی یہ نصیحتیں سننا پڑیں کہ کہیں ہمیں نہ بھول جانا یعنی کہ واپس آنا۔ میں اپنے علاقہ کرناہ کے ہر گاؤں میں گیا لوگوں سے ملا، الوداعی ملاقاتیں ایسی ہو رہی تھیں کہ جیسے لوگوں کو الہام ہو گیا تھا کہ اب میں نے ان کو نہیں ملنا۔ ہر کوئی اس طرح رخصت کرتا تھا کہ جیسا آخری ملاقات ہو۔

ان لوگوں کے خلوص محبت اور ایثار کو سلام۔غریب لوگ اخلاص اور پیار کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں جو کبھی لٹتی نہیں بکتی نہیں، صرف بانٹی جاتی ہے، نظر نہیں آتی لیکن محسوس کی جاتی ہے۔لوگ مجھ سے میری ذات کے علاوہ میرے نانا جان اور سسرال والوں کی وجہ سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ اس علاقے کا کوئی بھی ذی عزت آدمی ایسا نہیں تھا کہ جو ان لوگوں کو ہر لحاظ سے اپنا قبلہ و کعبہ نہ سمجھتا ہو۔لوگوں نے اس وجہ سے بھی زیادہ دلچسپی لی کہ اس علاقے سے علی الاعلان میں پہلا شخص تھا جو قانونی طور پاکستان جانے والا تھا۔لوگوں کو یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے میرا منہ تکتے تھے کہ یہ کیسا شخص ہے جو برملا پاکستان جانے والا ہے۔

امرتسر سے لاہور

بالآخر وہ گھڑی آ گئی جب ہم لوگوں نے رخت سفر باندھنا تھا۔ میری خواہش تھی کہ 14 اگست کو مجھے پاکستان میں ہونا چاہیے۔ جو کشمیر کے لوگ مقبوضہ دھرتی میں رضا کارانہ طور عقیدت سے اور پاکستان کے لوگ سرکاری ڈیوٹی یا چھٹی کے طور مناتے ہیں لیکن کچھ دیگر مجبوریوں کی بنا پر یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ہم لوگ 20/21 اگست 1976 کو گھر سے سرینگر اور وہاں سے جموں کے لیے نکلے۔ میری فیملی کے علاوہ چند دیگر عزیز بھی ساتھ تھے۔سرینگر سے جموں تک کا راستہ میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھی کیوں کہ علی گڑھ میں تعلیم کے دوران اکثر اس روٹ پر سفر کیا تھا اور پاسپورٹ اور ویزا کے حصول کے لیے اسی سال دو بار دہلی آنا جانا ہوا تھا۔ رات جموں میں گزاری اور اگلی صبح خصوصی ٹیکسی کے ذریعہ

امرتسر کے لیے چل دیئے۔ہم نے ایک رات یہاں گزاری، اگلے روز صبح نو بجے ریل امرتسر سے لاہور کے لیے نکلنی تھی۔ امرتسر میں ہم لوگ اپنے دوست دلاور میر کے عزیز محمد مقبول کے ہاں ٹھہرے جو وہاں پر جموں کشمیر پراپرٹی کا جنرل منیجر تھا۔ ہندوستان میں مہاراجہ کشمیر کی پراپرٹی سرکاری تحویل میں کشمیر حکومت کے پاس ہے جبکہ پاکستان میں یہ پراپرٹی حکومت پاکستان کے پاس ہے۔اور اس کی آمدن کو بجٹ میں دکھایا بھی نہیں جاتا۔

اگلے روز صبح جب ٹرین چلی تو ہندوستانی علاقہ میں راستے کے دونوں طرف بارڈر سیکورٹی فورس کے پیدل اور گھڑسوار لوگ پٹڑی کے آس پاس گشت کر رہے تھے۔راستے میں ایک مقام پر ٹرین چند لمحوں کے لیے رکی اور چل دی۔ٹرین میں مختلف قسم کے باوردی لوگ سوار ہو گئے۔ میں حیران ہو گیا کہ یا اللہ آنکھ جھپکنے میں یہ لوگ کس طرح بدل گئے؟ اپنے اپنے سے لگنے لگے لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے وردی اور رویہ کس طرح اچانک بدل لیا ہے۔ایک بندوق بردار سے میں نے پوچھا، لاہور آنے میں کتنا وقت اور لگے گا؟ اس نے کہا کہ دس پندرہ منٹ۔اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو کر بات چیت میں لگ گئے۔تعارف کروانے پر مجھے پتا چلا کہ یہ پاکستانی رینجرز کے لوگ ہیں جو آنکھ جھپکنے کی ساعت میں ہندوستانی سیکورٹی فورسز کے اترنے کے ساتھ ہی ٹرین میں چڑھ آئے تھے۔ یہ میرا کسی پاکستانی اور وہ بھی پاکستانی محافظ سے پہلا ٹکراؤ تھا۔

امرتسر سے لاہور تک راستے کے دونوں اطرف ایک ہی قسم کے کھیت کھلیان پھل بوٹے اور شجر وحجر تھے۔مکانوں اور مکینوں کی چال ڈھال اور بود و باش ایک جیسی گردواروں، مندروں اور مسجدوں کے گنبد تقریباً ملتے جلتے۔کوٹھا نما مکانوں کے سامنے بھینس، بکریاں بندھی ہوئی' درختوں کے سائے میں چارپائی بستر لگا ہوا۔ادھر پنجابی ہندو اور سکھ اور ادھر پنجابی مسلمان پنچایت جمائے بیٹھے تھے۔ پاکستانی سپاہی کے تعارف کے بعد تھوڑا تھوڑا فرق محسوس ہونا شروع ہوا کہ پاکستان شروع ہو گیا ہے۔خوشی کے مارے جذبات بے قابو ہوئے جا رہے تھے کہ یا اللہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس جگہ پہنچ آئے ہیں جہاں پہنچنے کے لیے ہر کشمیری مسلمان حج جیسی حسرت رکھتا ہے۔اس تعارف سے پہلے اور بعد کی سوچ میں زمین آسمان

کا فرق آ گیا۔اب پاکستان کو میں پاکستانی نہیں بلکہ کشمیری مسلمانوں کی نظر سے دیکھنے لگا۔ ہر چیز منور ومعطر نظر آنے لگی۔نقص بھی مصلحت پر مبنی نظر آنے لگا۔اتنے میں ایک ٹین کی چھت کے زیر سایہ لوگوں کا ہجوم نظر آیا اور ٹرین کی رفتار سست پڑتے پڑتے سکوت کا شکار ہو گئی۔جس کو لوگوں کے جوش وجذبے سے بھرپور شور وغل نے توڑا ہم لوگ اپنی بوگی سے اترے فرسٹ کلاس ہونے کی وجہ سے اتفاقاً یہ بوگی اس جنگلے سے بہت قریب رکی جہاں سے ہمیں نکلنا تھا لیکن یہ جگہ اس انکلوژر کے اندر تھی جو اس ٹرین کے مسافروں کے لیے مختص تھا۔ جہاں سے امیگریشن کے منکر نکیروں کے سوال جواب اور کسٹم والوں کی چھری سے گزر کر آگے جانا تھا۔انکلوژر سے باہر سارے لوگ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے انتظار میں تھے۔ مجھے دو تین چہرے اپنے اپنے نظر آئے حالاں کہ اس سے پہلے ان کی تصویر تک بھی نہیں دیکھی تھی۔ جب باہر نکلا تو ان ہی مانوس چہروں نے مجھے گھیر لیا اور پوچھا کہ منظور نام کے کشمیری فیملی آپ تو نہیں ہیں؟ میں ہاں کہنے سے پہلے پوچھنے والے کے گلے سے لپٹ گیا۔تعارف پر پتا چلا کہ میرے پھوپھی زاد بھائی داؤد گیلانی ہیں۔انہوں نے باقی لوگوں کا تعارف کروایا جن میں میرا چھوٹا بھائی نذیر گیلانی، بڑے چچا غلام مرتضیٰ گیلانی مرحوم اور مقصود گیلانی مرحوم تھے جو رشتوں کی قربت کے علاوہ پاکستان میں قیام کے دوران میرے ہمدم اور ہم قدم رہے۔ میں نے اپنی شعوری زندگی میں پہلی بار ان لوگوں کو دیکھا اور مجھے پاکستان میں اپنے تمام اقربا میں سے یہی زیادہ قریب معلوم ہوتے رہے۔

افسوس کے 8 اکتوبر 2005 کے زلزلے نے ہزاروں قیمتی جانوں کے ساتھ اس انمول مقصود گیلانی کو بھی ہضم کر لیا جس کی لاش بھی 8 دن کے بعد اسی جگہ سے ملی جہاں سے ہمارے دوسرے عزیز موت کو جُل دے کر نکل آئے۔مقصود گیلانی مظفر آباد کے ہر دل عزیز، ظریف اور جان نثار کرنے والے شخص تھے۔زندگی میں پہلی بار متعارف ہوئے لیکن لگتا تھا کہ جیسے صدیوں کا ساتھ رہا ہو۔ یہ عجیب کیفیت تھی جو الفاظ کے احاطے میں نہیں آ سکتی، بظاہر ایک افسانہ اور فلمی داستان لگتی ہے لیکن ہے حقیقت۔

؎ ہیروں سے لوگ خاک زمیں سونپ کر
مت پوچھ ہم نے کیا کیا خزانے گنوا دیئے

پہلا پڑاؤ، لاہور

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں لاہور میں ہوں جو ہر پڑھے لکھے کشمیری کے خوابوں کا محور ومرکز ہے۔ یہ لوگ مجھے لاہور ریلوے سٹیشن سے انارکلی میں واقع دہلی مسلم ہوٹل میں لے گئے جہاں ہم لوگوں نے دو دن قیام کیا۔ میرے خاندان کے سارے لوگ خود پیر ہونے کی وجہ سے بہت ہی پیر پرست ہیں۔ میرے بڑے چچا غلام مرتضیٰ گیلانی مرحوم مجھے داتا دربار، شاہ محمد غوث جو ہمارے جد ہیں اور دیگر مزارات پر لے گئے۔ اس کے علاوہ راوی کے کنارے ایک اللہ والے شخص فقیر بیٹھا کرتے تھے، اس کے حضور بھی پیش کیا۔ مینارِ پاکستان، مغلیہ باغات اور لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کروائی۔ ہمیں بانڈی پور میں والدہ کے چچا زاد ڈاکٹر شیریف الدین ختلانی مرحوم لاہور کی علمی وادبی، سیاسی و سماجی برتری کے واقعات سنایا کرتے تھے جو اب اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ لاہور میں اگلے روز میں نے اپنی بیوی کے رشتہ میں چچا رحمت الٰہی کی تلاش کی جو ریلوے میں ملازم تھے، تلاش میں اتفاقاً میں نے انہی سے پوچھا کہ میں اس آدمی سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں ہی ہوں۔ اس برجستہ ہاں پر پریشان ہو گیا۔ پھر انہوں نے مجھے اپنا تعارف کروانے کو کہا جب انہوں نے سنا کہ میں ہندوستان سے آیا ہوں تو وہ تذبذب کا شکار ہو گئے نہ انکار کر سکتے تھے اور نہ اپنے اقرار پر قائم رہنے کی پوزیشن میں تھے۔ بہرحال میری بیوی پر بھی جرح کے بعد ان کو یقین ہو گیا کہ ہم لوگ مشکوک نہیں ہیں۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے جہاں ان کی سلیقہ شعار بیوی سے ملاقات ہوئی۔ وہاں ہم لوگ چند ہی گھنٹے ٹھہرے۔ تیسرے دن ہم لوگ لاہور سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔

بیوی کی بے نقابی

ان دنوں بلکہ پہلے ہی دن میں نے اپنے چچا کے اشارے کنایے سے محسوس کیا کہ انہوں نے میری بیوی کو برقعے کے بغیر دیکھ کر بُرا منایا۔ مظفر آباد میں گھر پہنچ کر اس سے بھی زیادہ احساس دلایا گیا۔ کشمیر میں اس زمانے میں اکثر خواتین نے برقعے چھوڑ دیئے تھے اور چادر دوپٹے ہی استعمال کرتی

تھیں۔ ہمارے خاندان کی خواتین میں سے اکثر اب بھی برقعے استعمال کرتی ہیں۔ تاہم آہستہ آہستہ اب یہ متروک ہوتے جا رہے ہیں۔ کشمیری ملازمت پیشہ خواتین کی اکثریت برقعے استعمال نہیں کرتی۔ البتہ اب سکارف کا استعمال عام ہے جو یقیناً بہت ہی شاندار لباس ہے۔ پردہ اصل میں تہذیبی روایت ہے صرف مذہبی پابندی نہیں یا پھر ہر مذہب کی روایت رہی ہے جو اب متروک ہوتی جا رہی ہے۔ ہندوستان کے اندرونی حصوں بالخصوص راجستھان، اتر پردیش، اور باقی جنوبی ہندوستان میں ہندو خواتین اپنے خاوند، باپ، بھائی، چچاؤں اور ماموؤں کے علاوہ سب سے پردہ کرتی ہیں۔ یہ صرف اسلام کی تعلیم ہی نہیں بلکہ تہذیب کی تعلیم بھی ہے جس کو اسلام نے مذہبی تہذیب کے طور درست طور پر اپنایا ہے۔ تاہم ہر زمانے اور ہر ملک کے پردے کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ فی زمانہ سکارف بڑی چادر اور دوپٹہ بہترین پردہ ہے اور یہ ضرور ہونا چاہیے۔ اس میں خاتون ایک گلدستہ میں ملفوف پھولوں کی طرح لگتی ہے۔ اچھا لگنا ہی ایک خاتون کا حسن ہے۔ منہ کا چھپانا نہ کوئی پردہ اور نہ کوئی عقلمندی ہے۔

؎ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

گولڑہ شریف میں قیام

راولپنڈی میں ہمارا قیام گولڑہ شریف کی درگاہ کے ساتھ ایک مکان میں ہوا۔ یہاں پیر صاحب نے ہم کو رہائش کے لیے تین کمرے دیئے۔ روٹی پانی کا بندوبست ان ہی کا تھا۔ میرے خاندان کے سارے لوگ گولڑہ شریف والوں کے مرید ہیں اور ہم لوگ ہم نسب بھی ہیں، اس لیے ان کے ساتھ پورے خاندان والوں کی بہت ہی قربت چلی آ رہی ہے۔ اس وقت پیر غلام محی الدین صاحب زندہ تھے، میرے چچا نے ان کے ہاتھ پر مجھے بیعت کرائی۔ انہوں نے مجھے ہر نماز کے بعد دس دفعہ کلمہ طیبہ اور دس دفعہ درود شریف پڑھنے کا وظیفہ دیا غالباً ہر شخص کو یہی وظیفہ دیتے ہیں۔ گولڑہ شریف میں ہمارا تقریباً ایک ہفتہ قیام رہا کیوں کہ ہمارے پاس مظفر آباد جانے کے لیے ویزہ نہیں تھا جس کو وزارت داخلہ سے endorse کروانا تھا۔ بیوروکریسی اپنا کام اپنی سہولت اور مرضی کے مطابق کرتی

ہے، لوگوں کی مجبوریوں یا ضروریات کے مطابق نہیں۔ ادھر مظفر آباد میں والدین اور دیگر عزیز و اقارب ہماری ملاقات کے لیے بے تاب تھے اور ہر روز یکے بعد دیگر کوئی رشتہ دار ہماری ملاقات کے لیے راولپنڈی آتا رہا۔ جب مظفر آباد کے ویزے کی کارروائی مکمل ہوگئی تو ہم نے گولڑہ تھانے میں اپنی روانگی رپورٹ ڈال کر مظفر آباد کے لیے سفر شروع کیا۔ اس زمانہ میں مظفر آباد راولپنڈی روڈ کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور سب سے اچھی سواری ایک ویگن ہوا کرتی تھی جس پر سوار ہو کر ہم لوگ عازم سفر ہوئے۔

سلطان مظفر کی نگری

راستے میں مجھے بھائی نذیر اور چچا صاحب مختلف جگہوں کا تعارف کرواتے رہے، حتیٰ کہ ہم کوہالہ پہنچ گے۔ کوہالہ کا نام ہم اکثر سنتے رہتے تھے کیوں کہ ہزارہ اور پنجاب کی گزرگاہ پر واقع ہے اور انگریزوں کے زمانے میں یہاں سے آگے برٹش انڈیا شروع ہو جاتا تھا۔ آج کل عام طور پر یہاں سے آگے کے علاقے کو پاکستان اور ادھر کو آزاد کشمیر کہتے ہیں حالاں کہ یہ سارے کا سارا پاکستان ہے۔ مجھے ان لوگوں سے آزاد کشمیر کو پاکستان سے الگ کہنے کی بات اچھی نہیں لگی لیکن یہ بات آزاد کشمیر میں غلط العام ہے جبکہ مقبوضہ کشمیر میں ہندوستان یا کشمیر نہیں بلکہ کشمیر سے باہر جانے کی صورت میں اس شہر یا صوبے کا نام لیتے ہیں جہاں جانا ہو مثلاً دہلی، ممبئی، کلکتہ، امرتسر وغیرہ۔

مجھے کوہالہ دیکھ کر مایوسی ہوئی اس کی تاریخی حیثیت کے مغائیر یہاں کے ٹوٹے پھوٹے چھپر، گند اور بدبو سے لگا کہ کسی گندگی کے ڈھیر پر آ پہنچے ہیں۔ کوہالہ کی تعریف اکثر میں نے اسلم نامی ایک شخص سے سنی تھی جو منہا سا کا رہنے والا تھا اور سرینگر میں Box and Co. کے نام سے گھڑیوں کا مکینک تھا۔ دلائی کے مقام کے قریب مجھے وہ جگہ اور ریسٹ ہاؤس دکھایا گیا جہاں قائداعظم اور پنڈت جواہر لعل نہرو نے قیام کیا تھا جو بعد ازاں دلائی کیمپ کے نام سے بہت مشہور ہوا، اور بھٹو مخالفین کا عقوبت خانہ بنایا گیا تھا۔ مظفر آباد بینک روڈ جو یہاں کا مین بازار ہے کی چند ایک دکانیں کسی رنگ روپ میں تھیں وگرنہ ان کی شکل وصورت بھی کسی شہری بازار کی سی نہیں تھی۔ میرا مظفر آباد کے بارہ میں سارا تصور

ہی چکنا چور ہو گیا۔ میرے خیال میں سرینگر، بارہ مولہ اور سوپور جیسے شہروں کو دیکھنے والا ہر شخص مظفر آباد کو دیکھ کر ایسا ہی محسوس کرتا ہوگا۔ وہ شہر صدیوں سے آباد ہونے اور حکمرانوں کی نظر اور بود و باش میں رہے ہیں جبکہ مظفر آباد محض ایک گزرگاہ کے طور استعمال ہوتا تھا گزرگاہیں عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں جس طرح سرینگر جموں روڈ پر واقع بٹوت، کد، بانہال اور چنینی۔

اب تو مظفر آباد ماشاء اللہ کسی بھی اچھے شہر کے مقابلے میں ہے۔ 8 اکتوبر 2005 کے زلزلے نے ہزاروں لوگوں کی زندگیاں لے کر اس شہر کو نئی رونق اور وسعت بخشی ہے۔ نقصان جانی اور مالی ضرور ہوا لیکن مالی نقصان کی تلافی ایسے ہوئی کہ مظفر آباد کی تعمیر و ترقی اور بود و باش میں ایک ہزار فیصد فرق پڑ گیا۔ دنیا بھر سے امدادی کارکن امداد لے کر پہنچے۔ شہریوں نے ملک کے بڑے شہروں کا اور دیہات نے مظفر آباد شہر کا رخ کیا۔ تعمیر نو کے منصوبوں نے کاروبار کو عروج بخشا۔ حکومتی مشینری بالخصوص ERRA نام کی تنظیم نے تعمیر نو کے نام پر کروڑوں روپے سمیٹے۔ زلزلہ زدہ علاقوں کے لیے آنے والی امداد ERRA(Earthquick Reconstruction and Rehabilitation Authority) نے شیر مادر کی طرح ہضم کر لی۔

ہم لوگ رات کے تقریباً 10 بجے گھر پہنچے، سب لوگ انتظار میں تھے۔ والدین، دادی جان، چچاؤں، چچیوں، پھوپھیوں اور درجنوں کزنز سے ملاقات ہوئی۔ ایک خون اور ایک رشتہ ہونے کے باوجود برسوں کی دوری اور عدم اختلاط کی وجہ سے ہم سب ایک دوسرے کو اجنبی لگتے تھے۔ مظفر آباد کے محلہ شاہناڑہ کے ایک ہی گھر میں میرے والد صاحب کے تین بھائی مع فیملی رہتے تھے جو نفری کے مقابلے میں کم تھا۔ یہ لوگ اصل میں ہجرت کے بعد لیپہ میں آباد ہو گئے تھے۔ یہاں ان لوگوں نے اچھی خاصی زمینیں خرید لی تھیں لیکن 1965 اور 1971 کی پاک بھارت جنگ کے بعد وہ حصہ رہائش کے قابل نہیں رہا کیوں کہ وہاں ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں آمنے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں اور ان لوگوں کی زمین کے دو حصے ہو گئے تھے جس کے دونوں حصوں میں دونوں ملکوں کی فوجیں مورچہ زن ہیں۔ آئے روز کی گولہ باری کی وجہ سے اس گاؤں کے سب لوگ گھر چھوڑ گئے تھے جس کو جہاں بہتر

سہولت میسر آئی، وہاں آباد ہو گیا۔ ہمارے لوگ مظفر آباد شہر میں آباد ہو گئے جہاں پہلی ہجرت کے بعد دوسری ہجرت کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی ہجرت کے بعد لیپہ میں آباد ہونے کے دوران زمینداری کے حوالہ سے کافی زمینیں خرید لی تھیں اور وافر مقدار میں سال بھر کا غلہ راشن ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اخروٹ اور میوے بالخصوص سیب، ناشپاتی، چیری وافر مقدار میں ہوتے تھے۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ ٹیچر تھے جبکہ دو چچگان سید اشرف علی اور سید غلام مرتضیٰ محکمہ مال میں تحصیلدار اور گرداور تھے اور ایک چچا اصغر گیلانی محکمہ لوکل گورنمنٹ میں پروجیکٹ مینیجر تھے۔ سب لوگ اکٹھے رہتے تھے اور پڑھے لکھے تھے اس لیے لیپہ اور مظفر آباد میں آسودہ حال اور کافی اثر ورسوخ کے حامل ہیں۔

فرسٹریشن

مہینہ بھر تو میرے پاس ملنے والے لوگوں کا تانتا بندھا رہا چوں کہ جنگ بندی کے بعد اور اس علاقے سے تعلق رکھنے والا میں پہلا شخص یہاں آیا تھا۔ میں مقبوضہ کشمیر میں اپنی پیشہ ورانہ اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے جانا پہچانا جاتا تھا اور اکثر لوگوں کو بہت حوالوں سے جانتا تھا جن کے رشتہ دار اپنوں کا حال احوال پوچھنے آتے تھے۔ حسب رواج دعوتیں بھی ہوا کرتی تھیں جہاں سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا ہے میرے یہاں کے بارے میں تاثرات کچھ اچھے نہ تھے جس کا میں کھل کر اظہار کرتا تھا جس پر میرے عزیز واقارب خوش نہیں تھے اور مجھے محتاط رہنے کا کہا کرتے تھے۔ اس محتاط رہنے کی عادت نے ہمیں بحیثیت مجموعی منافق بنا دیا ہے۔ جتنی جلدی قوم اس عادت سے چھٹکارا پا کر راست بازی اور بے ساختگی اختیار کرے گی، اتنی ہی جلدی کامیابی اور ترقی کرے گی۔ مجھے ملنے آنے والوں میں سے منظور میر صاحب تحصلید ار بار بار شاہ صاحب کے نام سے پکارتے تھے جس پر میں نے ان کو کہا، میں کھتری نہیں ہوں۔ انہوں نے ہنس کر کہا، ہمارے ہاں سیدوں کو شاہ صاحب کہتے ہیں۔ یہ میرے لیے نئی بات تھی۔

میں نے اس عرصہ میں سرکاری دفاتر، عدالتوں اور مختلف جگہوں کا دورہ کیا اور یہاں کے

سسٹم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ کشمیر کے اس حصے کے مقابلے میں مجھے یہاں زیادہ ہلہ گلہ اور غل غپاڑہ لگا جبکہ وہاں آزادی کے بعد ٹرینڈ سسٹم موجود رہا، صرف انداز کارگزاری بدل گیا۔ بہتر پڑھے لکھے لوگ اس حصے سے تعلق رکھتے تھے جو تقریباً سارے کے سارے ہی ادھر رہ گئے اور جو چند ایک یہاں پر آئے، انہوں نے سسٹم کو تھوڑا بہت سہارا دیا۔ یہاں آنے والا جو شخص اُدھر کلرک تھا، وہ ادھر سیکشن آفیسر بن گیا اور جو پٹواری تھا وہ تحصیلدار۔ علیٰ ہذا القیاس جو جس قابلیت اور اہلیت کا مالک سمجھا گیا اس کو اس سے بڑھ کر حیثیت مل گئی جس نے سسٹم کو رواں کر دیا۔ بے سروسامانی کے عالم میں ایسا ہونا بھی غنیمت تھا۔

میری طبیعت جلدی اکتا گئی اور میں واپس جانے کی تیاری میں جت گیا۔ میری بیوی اپنے آپ کو بے چین محسوس کرتی تھی کیوں کہ ایک تو یہ اس طرح کا پردہ نہیں کرتی تھی جس طرح میری بہنیں اور دیگر رشتہ دار خواتین کرتی تھیں، جس وجہ سے ایک کھچاؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ دوسرا اس کا تعلق سادات کے کسی گھرانے سے نہیں تھا جو کم از کم میری والدہ اور دادی کو قابل قبول نہیں تھا، جو صرف سید اور وہ بھی گیلانی ہی قبول کر سکتے تھے۔ کشمیر میں ایسی کوئی تخصیص نہیں ہے کہ سید بالخصوص سید لڑکی صرف سید لڑکے سے بیاہی جا سکتی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں کہیں کہیں ایسی روایت ہے لیکن عام نہیں۔ میں خود بھی بے روزگار اور بے کار تھا جس کی وجہ سے بہت فرسٹریشن پیدا ہو گئی۔ لیکن میری والدہ اور دادی جان جو اس وقت زندہ تھیں اور بڑے چچا سید غلام مرتضیٰ مرحوم میرے ادھر ہی رہنے پر مصر تھے اور مجھے کسی حال میں واپسی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس کیفیت نے مجھے عجیب سی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔

والدین کی وجہ سے مجھے ویزے میں بار بار ایک ایک مہینے کی توسیع کروانا پڑتی تھی۔ اس طرح اسلام آباد آنے جانے میں ایک ہفتہ خوشی خوشی گزر جاتا تھا، اس میں میرا ہمسفر کزن سجاد گیلانی ہوتا تھا۔ گھر کا ماحول بہت حوالوں سے تلخ تھا۔ گھر کے دوسرے افراد کے میری بیوی کے ساتھ رویے نے مجھے بہت پریشان کیا تھا جو بہت ہی نامناسب تھا۔ اس وجہ سے میں اور بھی زیادہ بددل ہو گیا تھا کہ جب اپنے تئیں جو ہم دونوں کا سانجھا تھا، اور سسرال واپس جاؤں گا تو میری بیوی کے ساتھ میرے والدین اور رشتہ داروں کے ناروا رویے کے پیش نظر ان کا کس طرح سامنا کروں گا جنہوں نے مجھے نہ

صرف ہر طرح کا بلکہ ماں باپ سے بڑھ کر پیار دیا تھا۔ یہ بات مجھے سب سے زیادہ کھائے جا رہی تھی اور میرے واپس جانے میں یہی ایک بات سد راہ تھی۔ اللہ تعالی جب کوئی کام کرنے پر آتا ہے تو حالات ایسے پیدا کر دیتا ہے کہ اس کام کا تانا بانا بننا شروع ہو جاتا ہے۔ اس عرصہ کے دوران مظفر آباد کے مضافات میں رہائش پذیر میرے والد صاحب کے چچا سید محمد حسن شاہ صاحب کی فیملی نے ہماری بڑی دلجوئی کی اور سکون کا باعث بنے۔

فطرت کرتی ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

یا یوں کہتے ہیں کہ

مجھے توڑ دے کوئی تو میں مضبوط ہوتا ہوں
مجھے دنیا کی نفرت سے بکھر جانا نہیں آتا